© rasailojaraid.com

پروفیسر چوہدری نذیر احمد

قدیم تشبیہات میں اقبال کے تصرّفات

اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور ہر شاعر کو اپنے خیالات واحساسات کے اظہار و ابلاغ کے لیے زبان و بیان کے وہی پیمانے استعمال کرنے پڑتے ہیں جو اس کے خاص زمانے میں مروّج اور متداول ہوں۔ اور عموماً وہی الفاظ، وہی تراکیب، وہی تلمیحات، وہی تشبیہات اور وہی استعارات استعمال میں لانے پڑتے ہیں جو اس کے پیشرو شاعر استعمال میں لاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سید عابد علی عابد، شعرِ اقبال میں لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی کے آخر تک اُردو کی شعری روایت کے تمام علائم و رموز معین ہو چکے تھے۔ اصطلاحات واضح تھیں۔ استعارات، تشبیہات اور تلمیحات کا بہت قیمتی ذخیرہ دیوانوں میں موجود تھا۔ شعری روایت میں وہ محاسنِ سخن بھی موجود تھے جن سے کام لے کر اُپچ والا صنّاع ابلاغ و اظہار کی منزلیں بڑی خوبی سے طے کر سکتا تھا۔ بالفاظ دیگر اردو کی کلاسیکی شعری روایت کے دامن میں تلمیحات، تشبیہات، استعارات، علامات، اصطلاحات اور کنایات کا اتنا وسیع ذخیرہ تھا کہ وہ فنکار جو وارداتِ زندگی کی بجائے خارجی زندگی کی تصویر کشی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے راستہ بالکل ہموار کیا جا چکا تھا اور اقبال نے اردو کلاسیکی شعری روایت کے تمام علائم و رموز اور تمام اصطلاحات سے استفادہ کیا۔"

ہم سید عابد علی عابد کے اس خیال سے اتفاق رائے رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم بڑے وثوق سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال ایک عظیم شاعر تھا اور دنیا کے دوسرے عظیم شاعروں کی مانند وہ خود بھی خلّاق المعانی تھا۔ اس نے اپنی اُپج اور ذوقِ سلیم کی مدد سے کئی نئے الفاظ اور نئی تراکیب پیدا کیں۔ بعض قدیم الفاظ کو نئے معنی عطا کیے اور بعض قدیم تشبیہات کو اپنے تصرف سے ایک نیا رنگ بخش دیا جو اقبال سے پہلے کسی اردو شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ اس خیال کی وضاحت کے لیے ہم کلام اقبال میں سے چند ایک تشبیہات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش کرتے ہیں۔

حباب

حباب یعنی پانی کے بلبلے کی مدتِ حیات بہت ہی قلیل ہوتی ہے۔ ادھر بلبلا بنا، اُدھر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس وجہ سے قدیم شعرا انسان کی چند روزہ زندگی کی بے ثباتی ظاہر کرنے کے لیے اسے حباب سے تشبیہ دیتے ہیں:

مثلاً: کیا بھروسا ہے زندگانی کا
آدمی بلبلا ہے پانی کا (میر)

یا: نمود کرکے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی ایک بلبلا تھا پانی کا (میر)

یا: وہ بہاریں وہ فضائیں وہ ہوائیں وہ سرور
وہ طرب وہ عیش کچھ جس کا نہیں حد و حساب
وہ جو سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر
رہ گئے حیرت زدہ وہ قصر ویران و خراب (نظیر)

خود اقبال بھی قدما کی تقلید میں حباب کو مختصر سی زندگی کی وضاحت کے لیے مشبہ بہ ٹھہراتے ہیں:

۱۔ بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی (اخترِ صبح۔ بانگِ درا)

۲۔ قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی (خضرِ راہ۔ بانگِ درا)

۳۔ موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی (فلسفۂ غم۔ بانگِ درا)

حباب اپنی شکل اور وضع کے لحاظ سے ایک اوندھے پیالے کی مانند ہوتا ہے۔ حباب کی اس شکل و وضع کو دیکھ کر اقبال نے اس سے اپنے پیغام کے ابلاغ کے لیے ایک ایسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تشبیہ پیدا کی ہے جو شعرائے سلف میں سے کسی کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ فرماتے ہیں:

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو

عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر (شمع اور شاعر)

اقبال کا پیام خودی کی حفاظت یا خودداری ہے۔ اس پیام کو وہ مختلف الفاظ میں مختلف انداز میں اور نئی سے نئی تشبیہات و استعارات کے ذریعہ سے ذہن نشین کرتے ہیں۔ اس پیغام کی تبلیغ کے لیے مختلف پیرایہ ہائے اظہار پر فکر کرتے ہوئے انھیں حباب نظر آتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے اس پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ ایک کمزور اور بے بساط سی ہستی اتنی خوددار ہے کہ دریا میں رہتے ہوئے پانی کی اتنی کثرت اور وسعت دیکھ کر بھی اس سے پانی نہیں مانگتی۔ حرفِ سوال لب پر لانا تو کجا، اپنے پیالے کو بھی اوندھا کر دیتی ہے۔ یہ غیور ہستی "حباب" ہے۔ اقبال اپنے قارئین کی توجہ پانی کے کمزور سے بلبلے کی طرف منعطف کراتے ہیں کہ اگر تمھاری آنکھ بینا ہے۔ اگر بصیرت رکھتے ہو۔ تو حباب کو دیکھو اور خودداری کا سبق اس سے سیکھو۔ پھر ایک اور مقام پر بالکل واضح الفاظ میں تلقین کرتے ہیں:

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو

تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آبجو رہنا (تصویرِ درد)

دیکھیے۔ اقبال کے تصرف سے، یہ تشبیہ کس قدر بلند پایہ اور عظیم المرتبت ہو گئی ہے۔ قدما اس تشبیہ کو کمزوری، بے بسی، بے ثباتی اور ناپائیداری کے مضامین کی وضاحت کے لیے استعمال کرتے رہے۔ لیکن اقبال نے اسے ایسا زور عطا کیا اور ایسے معنی بخشے کہ اس زمین کو آسمان بنا دیا۔

شبنم

شبنم کو قدما موتی سے اور قطرۂ اشک سے تشبیہ دیتے رہے ہیں۔ مثلاً:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا (انیس)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا: رویا کیے ہیں غم سے ترے ہم تمام رات
پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام رات (مہبر)

یا: جوں گل تو ہنسے ہے کھکھلا کر
شبنم کی طرح مجھے رُلا کر (میراثر)

اقبال بھی شعرائے سلف کا تتبع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور اس موتی کو چمکاتی ہے سورج کی کرن (بالِ جبریل)

۲۔ شبنم کی طرح پھولوں پہ رو اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے (غزلیات، بانگِ درا)

۳۔ تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا (گلِ پژمردہ)

۴۔ جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں (بلادِ اسلامیہ)

مندرجہ بالا چند مثالوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اقبال قدما کی پیروی میں شبنم کو قطرہ ہائے اشک اور دانہ ہائے گوہر سے بھی تشبیہ دیتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی کارگاہِ فکر میں اس تشبیہ سے بھی ایک نرالی تشبیہ پیدا کی گئی جو اپنی نظیر آپ ہے اور وہ ہے تنک مایگی یا تنک بخشی کی تشبیہ یا استعارہ۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں (ہرجائی۔ بانگِ درا)

۲۔ تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ ہو منت کشِ شبنم نگوں جام و سبو کر لے (پھول۔ بانگِ درا)

۳۔ ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے (بالِ جبریل)

شبنم کو آرسی سے تشبیہ دینا بھی اقبال کے تصرفات میں سے ہے:

۱۔ رنگیں کیا سحر کو بانکی دُلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی (جگنو، بانگِ درا)

۲۔ آئیں تجھے دکھاؤں رخسارِ روشن اس کا
نہروں کے آئینے میں شبنم کی آرسی میں (چاند، بانگِ درا)

۳۔ حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں (بزمِ انجم، بانگِ درا)

گُل

پھول یا گل کی نزاکت، نفاست، خوشبو، رنگ اور خوبصورتی کی بنا پر قدما نے محبوب کو گل سے تشبیہ دی ہے۔ مثلاً:

یاد رہے میر کا مگر گل سا
کہ سحر نالہ کش تھا بلبل سا

یا: میں اس گل کو پیغام دیتا ہزاروں
ہوا ہو گئی پر ہوا کہتے کہتے

عموماً رخسار کو گل سے تشبیہ دی جاتی ہے اور بعض شاعروں نے چشم، لب، گوش وغیرہ کو بھی گل کے مشابہ ٹھہرایا ہے۔ مثلاً:

بنایا صانعِ قدرت نے تجھ کو ایک گل دستہ
دہن ہے غنچہ، آنکھیں نرگسِ شہلا ہیں رخ گل ہیں (سودا)

یا: کب کسی گلبن میں پھولے اس قدر یکبار گل
چشم گل، لب گل، جبیں گل، گوش گل، رخسار گل (نظیر اکبر آبادی)

یا: نازکی اس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے (میر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھول کے کھلنے کو محبوب کے ہنسنے کے ساتھ اور محبوب کے ہنسنے کو پھول کے کھلنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ مثلاً :

جوں گل تو ہنسے ہے کھلکھلا کر
شبنم کی طرح مجھے رُلا کر (امیر اثر)

یا : مجھے گل کے ہنسنے پہ آتا ہے رونا
کہ اس طرح ہنسنے کی خوبی کسی کی (سودا)

اقبال بھی اپنے کئی اشعار میں اسی قدیم تشبیہ کو قائم رکھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں :

ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو (التجائے مسافر)

لیکن گل سے انھوں نے ایک نئی دلکش اور موزوں تشبیہ بھی پیدا کی ہے۔ پھول کی مجموعی صورت گوش سے بھی ملتی جلتی ہے۔ بعض پھول آنکھ کے مشابہ ہوتے ہیں۔ بعض پھول زبان کی مانند ہوتے ہیں۔ سوسن کو زبان سے اور نرگس کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے :

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں (مثنوی گلزار نسیم)

لیکن اقبال کی نکتہ رس اور دقیقہ بیں نگاہ نے دیکھا کہ سو زبانوں کے باوجود گل ہمیشہ خاموش رہتا ہے اور ہمہ تن گوش رہتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے گل کو خاموشی کے ساتھ ایسی نسبت دی ہے کہ ایک نئی تشبیہ پیدا ہو گئی ہے۔ درج ذیل مثالوں پر غور فرمائیے :

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنشیں میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں (شکوہ)

یا : کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
خاموش صورتِ گل مانندِ بو پریشاں (رات اور شاعر)

جل ترنگ اور لہو ترنگ

جل ترنگ ایک قسم کا ساز ہے۔ چینی کی سات پیالیوں میں جو اپنے حجم کے لحاظ سے متفاوت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی ہیں، پانی بھر لیا جاتا ہے۔ اور ان کو اس ترتیب سے میز پر رکھا جاتا ہے کہ سب سے چھوٹی پیالی پہلے، پھر اس کے ساتھ اس سے بڑی، پھر اس کے ساتھ اس سے بڑی۔ علیٰ ہٰذا القیاس ساتوں پیالیاں ترتیب سے رکھ کر انھیں لکڑی سے اس طرح بجایا جاتا ہے جیسے مضراب سے ستار کو۔ اور ان پیالیوں سے سات سُر پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے اختلاط سے چابکدست فنکار کئی اور سُر پیدا کر لیتے ہیں، یہی جل ترنگ ہے۔ اسے "سازِ صدائے آب" بھی کہا گیا ہے۔ غالب کہتے ہیں :

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

جل ترنگ کی تشبیہ نشاط و مسرت کے اظہار کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ علّامہ اقبال نے اس تشبیہ میں ایک لفظ کی تبدیلی سے اسے اپنے پیام کے لیے موزوں بنا لیا۔ فرماتے ہیں کہ زندگی جل ترنگ نہیں۔ بلکہ "لہو ترنگ" ہے۔ یعنی یہ بہت محنت، جگر کاوی اور قربانی چاہتی ہے۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل نہ جلترنگ

دیکھیے۔ ایک لفظ کے تغیر سے اقبال نے کیا نئی تشبیہ پیدا کر دی ہے جو اُن کے پیام کے ابلاغ کے لیے کس قدر موزوں اور بلیغ ہے۔

گنجِ باد آورد اور گنجِ آب آورد

جو خزانہ کسی محنت، تکلیف یا تلاش کے بغیر مل جائے اسے گنجِ باد آورد کہتے ہیں۔ یہ محاورہ انگریزی زبان سے لیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں اچانک اور غیر متوقع طور پر حاصل ہونے والی خوشی یا دولت یا خزانہ کو (WINDFALL) گنجِ باد آورد کہتے ہیں:

دَولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

اقبال نے اپنے مقصد کی وضاحت کے لیے اس ترکیب میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کر کے اس سے استعارۃً بڑا کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

موجِ دُودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن مرا

(والدہ مرحومہ کی یاد سے)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آنسوؤں کو گنجِ آب آورد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ لفظ "آنسو" مذکور نہیں۔ اس لیے یہ استعارہ ہے اور دامن کا معمور ہونا اس استعارے کا قرینہ ہے۔ چونکہ استعارہ تشبیہ پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے تشبیہات کے ضمن میں کہیں کہیں استعارے کی مثال دینا بھی بے محل نہ ہوگا۔

قارون

قارون ایک افسانوی کردار ہے۔ جس نے اس قدر دولت جمع کی کہ کوئی اور نہ کر سکا۔ داستان گو بیان کرتے ہیں کہ اس کے خزانے اس قدر وزنی تھے کہ چالیس اونٹوں پر بمشکل بار کیے جا سکتے تھے۔ بعض مبالغہ پسند داستاں گو کہتے ہیں کہ قارون کے خزانے تو اس قدر زیادہ تھے کہ چالیس اونٹ تو ان مقفل خزانوں کی صرف چابیاں اٹھاتے تھے۔ متقدمین نے نثر یا نظم میں جب کبھی دولت یا خزانوں کی زیادتی اور کثرت کا ذکر کیا ہے، قارون کے نام کو بطور تلمیح یا تشبیہ یا استعارہ استعمال کیا ہے:

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا (آتش)

اقبال نے اس تشبیہ میں بھی ایک نئی معنوی خوبی پیدا کی ہے اور لفظِ قارون کو بطور طنز کے استعمال کیا ہے۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ اسلام نے قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک بعض ایسے جید عالم پیدا کیے ہیں کہ جن کے علم و فضل کی نظیر نہیں ملتی۔ ان فقید المثال عالموں کی عوام اور خواص سب نے بڑی عزت کی ہے۔ بادشاہوں نے ان کا احترام واجب سمجھا ہے۔ اقبال بھی ایسے بزرگوں کا نام ادب سے لیتے ہیں۔ لیکن ان علما کے ساتھ ساتھ بعض کم علم اور بے عمل ایسے لوگ بھی اسلامی معاشرے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنھیں اقبال ملّا کے نام سے پکارتے ہیں اور جن کے کردار پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حورِ و قصور و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت

ایسے مُلا لوگ جب اپنی علمیت اور عربی دانی جتاتے ہیں تو اقبال انھیں طنزاً لغت ہائے حجازی کا قاروں کہتے ہیں :

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

لغت کا قاروں ہونا (یعنی بے شمار الفاظ اور معانی یاد کرنا) اردو زبان میں نئی تشبیہ ہے ۔یعنی قارون کی مانند الفاظ کے خزانوں کا مالک ۔

قرآن

قرآن وہ مقدس کتاب ہے جسے ہم بنی نوع انسان کے لیے خدا کا آخری پیغام سمجھتے ہیں اور دیگر تمام مذاہب کی الہامی یا مقدس کتابوں کے مقابلہ میں اس کے اکمل، افضل اور اشرف ہونے پر ایمان رکھتے ہیں ۔ اس مقدس کتاب کی زیارت ہی ہمارے لیے بصیرت افروز ہے اور اس کی تلاوت ہزارہا برکات کا باعث ہے ۔ قدما نے محبوب کے چہرے کو بالخصوص رخساروں کو قرآن سے تشبیہ دی ہے ۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ کیجیے :

زلف واللیل، رُخ والفجر، نرگس چشمۂ کوثر
نمایاں ہے سوادِ خط کلام اللہ کی صورت (سودا)

مصحفِ رخ پہ لٹکتا ہے وہ گیسوئے سیاہ
بوسے قرآن کے لیتا ہے یہ ہندو ہو کر (ذوق)

مصحفِ رخ کی تلاوت ہے نہایت مشکل اس میں لے قاریو! زیر و زبر و پیش نہیں (آتش)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیرا رخِ مخطّط ، قرآن ہے ہمارا
بوسہ بھی لیں تو کیا ہے ایمان ہے ہمارا (میر)

علامہ اقبال نے اس تشبیہ میں عام شعرا کی پامال روش کو بالکل اختیار نہیں کیا اور محبوب کے چہرے کو قرآن سے تشبیہ دے کر قرآن پاک کی پاکیزگی اور تقدس کو اس کے اصل مقام سے نہیں گرایا۔ البتہ اقبال نے مردِ مومن یا انسانِ کامل کو قرآن سے تشبیہ دی ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن (ضربِ کلیم)

اسی ایک تشبیہ سے اقبال کے ذوقِ سلیم کا اور شعر گوئی میں اس کے منفرد اور جداگانہ روش کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ کہاں ایک روایتی اور خیالی محبوب کا چہرہ قرآن جیسا اور کہاں ایک مردِ مومن یا مردِ کامل جسے خدا نے بھی قرآن سے ہی تشبیہ دی ہے:

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

شاہین بجائے شیر

شیر کی تشبیہ عربی، فارسی اور اردو شاعری میں ایک قدیم تشبیہ ہے۔ شجاعت، دلیری اور بے باکی کی وجہ سے عام طور پر کسی جوانمرد کو شیر سے ہی تشبیہ دی جاتی ہے۔ میر انیس حضرت امام حسینؓ کا استعارۃً یوں ذکر کرتے ہیں:

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے
رَن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

بہادری، جفاکشی، دلیری اور بے خوفی کی صفات کو شیر کی تشبیہ سے ہی ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ تشبیہ قدیم ایام سے آج تک اسی طرح استعمال ہوتی چلی آرہی ہے۔

علامہ اقبال نے اس تشبیہ کو بہت ہی کم استعمال کیا ہے۔ جہاں تک راقم السطور ہذا کی یادداشت کام کرتی ہے اقبال کے کلام میں اس کی ایک ہی مثال نظر آتی ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (بالِ جبریل)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاید تلاشِ بسیار کے بعد ایک آدھ مثال اور مل جائے۔ حالانکہ اقبال کے کلام کا اکثر و بیشتر حصہ قوت و شوکت، دلیری اور شجاعت کا پیام دیتا ہے اور قوت و شوکت، دلیری اور شجاعت کا سب سے زیادہ مظہر شیر ہے۔

اقبال نے طاقت، جرأت، شجاعت، دلیری وغیرہ بہادری کی صفات کو ظاہر کرنے کے لیے شیر کی بجائے شاہین کا انتخاب کیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر (بالِ جبریل)

۲۔ شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا (بالِ جبریل)

۳۔ وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی (بالِ جبریل)

۴۔ اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت سے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا (بالِ جبریل)

۵۔ فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبال آگیا کیونکر
میسر میر و سلطاں کو نہیں شاہینِ کافوری (بالِ جبریل)

۶۔ گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو (بالِ جبریل)

۷۔ ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو (بالِ جبریل)

۸۔ ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ (بالِ جبریل)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہین کی تشبیہات اور استعارات کی بے شمار مثالیں کلامِ اقبال میں موجود ہیں۔ ہم مضمون کی طوالت کے خوف سے انھی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ شاہین کی تشبیہ اختیار کرنے کی وجہ علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں یوں بیان کی ہے:

"شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ (۱) خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (۳) بلند پرواز ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے اور (۵) تیز نگاہ ہے۔"[۱]

اقبال نے اپنے پیغام کے اظہار و ابلاغ کے لیے بعض قدیم تشبیہات کے معانی میں ایک تخصیص پیدا کر دی ہے۔ وہ جب بھی ان تشبیہات کو استعمال کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور ان کی یہ تخصیص ہر پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ان مخصوص تشبیہات کی چند مثالیں دیکھیے۔

کارواں۔ گردِ کارواں۔ بانگِ درا۔ بانگِ رحیل۔ رہرو۔ درماندہ رہرو۔ میرِ کارواں وغیرہ وغیرہ اصطلاحات سے علامہ اقبال نے جو تشبیہات وضع کیں ہیں، ان کا سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اجتماعی اسلامی زندگی کو ایک رواں دواں قافلے یا کارواں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بانگِ درا ہمارے رہنماؤں کی آواز (ان کے اشعار۔ ان کے خطبات اور ان کی تقاریر) ہیں۔ کبھی یہ کارواں برابر ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور کبھی رہنماؤں کی کج فہمی۔ ناعاقبت اندیشی اور بے بصری کے باعث تنزل کے عمیق گڑھوں میں گر جاتا ہے۔ جہاں سے باہر نکلنے کے لیے بڑا وقت درکار ہوتا ہے۔ اسلام کے عروج و زوال۔ پستی و بلندی، پیش روی اور درماندگی کو واضح کرنے کے لیے اقبال نے کارواں میرِ کارواں وغیرہ تشبیہات سے بڑا کام لیا ہے اور بانگِ درا کی ترکیب تو اقبال کو اس قدر پسند تھی کہ انھوں نے اپنے سب سے پہلے مطبوعہ اردو کلام کو بانگِ درا کا نام دیا:

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا (ترانۂ ملی)

---

[۱] علی گڑھ میگزین۔ اقبال نمبر ص ۱۰۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی قبیل کی چند ایک اور تشبیہات ملاحظہ کیجیے :

۱۔ چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں (شکوہ)

۲۔ پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے (طلوعِ اسلام)

۳۔ پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو (شمع اور شاعر)

۴۔ جرس ہوں نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے (غزلیات۔ بانگ درا)

اسی طرح اقبال تسبیح اور دانہ ہائے تسبیح سے ملت اسلامیہ کے اتفاق یا انتشار کو ظاہر کرنے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں :

۱۔ رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے (شمع اور شاعر)

۲۔ پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کا
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا (تصویرِ درد)

آہو

آہو یا غزال سے قدما نے جتنی تشبیہات بھی پیدا کی ہیں، وہ سب غزل کے روایتی محبوب کے لیے ہیں۔ مثلاً محبوب غزالِ رعنا کی مانند ہے۔ آہو چشم ہے۔ رم کردہ آہو ہے۔ آہو کی مانند وحشی ہے، انسانی صحبت سے غزال کی مانند دُور بھاگتا ہے۔ اس کی آنکھیں ہرن کی سی ہیں۔ ہے تو آہو مگر شیروں کا شکار کرتا ہے۔ اس آہو کے فتراک میں شیر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علامہ اقبال قدما کی روش کے برعکس منتشر مسلمانوں کو بھٹکے ہوئے آہو سے تشبیہ دیتے ہیں :

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے (دعا۔ بانگ درا)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور ہر عظیم شاعر کی مانند وہ قدما یا پیش رووں کی کورانہ تقلید سے بکلی اجتناب کرتے ہیں۔ عظیم شاعر اپنا راستہ خود تراشتے ہیں۔ وہ قدیم الفاظ، تراکیب، تشبیہات، استعارات، کنایات کے جسد مردہ میں ایک نئی رُوح پھونک دیتے ہیں۔ جو اُن کے کلام کو تازگی، طرفگی، ندرت، حلاوت اور دلنشینی کی صفات سے متصف کر کے اسے حیاتِ جاوید بخش دیتی ہے۔ اقبال ہفت اقلیم شاعری کے بادشاہ ہیں۔ اور ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح انھوں نے شعر کی مملکت میں کچھ پرانے رائج الوقت سکوں کو رائج رہنے دیا۔ کچھ سکّوں میں تھوڑی بہت ترمیم یا تبدیلی کی اور کچھ نئے سکّے اس قدر و قیمت کے چلائے کہ جن کی ندرت اور چمک و دمک اردو شاعری کے لیے ہمیشہ باعثِ فخر رہے گی۔

کلامِ حکیم

مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا مجموعۂ کلام ہے۔ خلیفہ صاحب مرحوم کو شعر گوئی کا ذوق فطری طور پر ودیعت ہوا تھا، اور انھوں نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی وغیرہ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کر کے اپنی شعری صلاحیتوں کا سکہ بھی بٹھا دیا۔ اس مجموعہ میں خلیفہ صاحب کے زمانۂ طالب علمی سے لے کر آخری دَور تک کا کلام شامل ہے جس کا بیشتر حصہ زمانۂ قیام حیدرآباد دکن (۱۹۱۸-۱۹۴۳) کی ادبی صحبتوں کی یادگار ہے اور اس مجموعے میں ان کے متوازن و متحرک ذہن کے گوشے بے نقاب نظر آتے ہیں۔

صفحات : ۱۵۲ قیمت : ۸ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com